ملک محمد توقیر احمد*

قاضی عبدالودود بحیثیت نقاد

Malik M. Tauqeer Ahmed

Abstract: Qazi Abdul Wadood (1896-1984) was a prestigious critic. He opted researched based criticism in Urdu. His critical reviews present thorough critical analysis of literary researches. He remained undaunted, unbiased and rational in his writings. In critical reviews he stately showed the errors of researches besides the points. According to him, the critic is not a teacher and criticism is not the name of comprehension, elaboration, and typifying the text. Critic is stipulate to pinpoint the errors. He is deliberately responsible to show the facts without using honey tongue. "Ghalib bahesiat Mohaqiq" "Azad bahesiat Mohaqiq" and "Molvi Abdul bahesiat Mohaqiq" was the pivotal series of his critical reviews. This paper introduces his critical work and also determines its worth.

کلیدی الفاظ: حافظ محمود شیرانی، غالبیات، قاضی عبدالودود، تحقیق و تنقید، مولوی عبدالحق

ہندوستان میں تحقیق پر عملی تنقید کی باضابطہ روایت کا آغاز حافظ محمود شیرانی کی ”تنقید بر شعر العجم“ سے ہوا۔ اس روایت کو پروان چڑھانے اور آگے بڑھانے میں سب سے نمایاں نام قاضی عبدالودود کا ہے۔ قاضی عبدالودود مزاجاً مشکک اور محقق تھے۔ انھوں نے تنقید سے اردو میں ادبی معلومات پر شک کرنے کا رجحان پیدا کیا۔ اس سلسلے میں ان کا پہلا تنقیدی مضمون ”معارف“ نومبر ۱۹۲۲ء میں ”دتاسی کا تذکرہ شعرائے اردو“ مراسلے کی شکل میں شائع ہوا۔ یہ خط مولوی محفوظ الحق کے متعارفہ ”تذکرہ شعرائے اردو“ پر تبصرے کی شکل میں لکھا گیا تھا۔ اس مراسلے میں قاضی صاحب نے گارسیں دتاسی کے مآخذ اور معلومات پر اعتراضات اٹھائے تھے۔ مولوی محفوظ الحق

*اسسٹنٹ پروفیسر (اردو)، گورنمنٹ کالج، انک

صاحب نے ”معارف“ اگست، ستمبر ۱۹۲۳ء میں قاضی صاحب کے درست اعتراضات کا اعتراف کیا اور متنازعہ فیہ امور میں دتاسی کو جانب حق قرار دیا۔ قاضی صاحب نے اس نقد التنفید کا خیر مقدم کرتے ہوئے تسلیم کیا کہ اُن کے بعض اعتراضات غلط تھے۔ اردو تنقید کی روایت میں یہ ایک اہم تنقید اور نقد التنفید تھی، اس کے بعد قاضی صاحب قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان چلے گئے۔ تاہم اُن کا تنقیدی سفر اس خط سے شروع ہو کر اُن کی وفات تک جاری رہا۔ اس دوران میں انھوں نے تقریباً (۱۲۰) مختصر اور (۱۰) مفصل تنقیدی تبصرے لکھے۔ ان تبصروں کے حامل دس تنقیدی مجموعے خدائش لا بیری پٹنہ سے شائع ہو چکے ہیں۔ قاضی صاحب کے تنقیدی تبصروں نے فکری سطح پر اردو تنقید اور عملی سطح پر اردو تحقیق کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ اُن کے تنقیدی تصورات منفرد خصوصیات اور عملی تنقیدات منفرد انداز کی حامل ہیں۔ اُن کی تنقیدی نچ، تصورات، عملی تنقیدات اور ان کے اردو تحقیق و تنقید پر اثرات پیش خدمت ہیں۔

قاضی عبدالودود نے تخلیقی ادب کے بجائے بیش تر تحقیقی تحریروں کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا۔ انھوں نے تنقید میں ہمیشہ عمومی اور تاثراتی رائے گریز کرتے ہوئے ایک ایک بیان کی صحت کو جانچا۔ گویا اُن کی تنقید انشائی جملات سے نہیں بل کہ جملات خبریہ سے متعلق ہے، جن کے صدق و کذب کا تعین ممکن ہے۔ اس بنا پر اُن کی تنقید کو ”تحقیقی تنقید“ کا نام دیا جاتا ہے۔ قاضی صاحب کی تنقیدی کسوٹی میں سب سے اہم چیز حق اور سچ ہے۔ وہ بے لاگ ہو کر تحریر کے ہر لفظ اور ہر جملے کے بیان کو اس میزان پر تولتے تھے اور بے باکی کے ساتھ اغلاط کی نشان دہی کر دیتے تھے۔ اُن کے نزدیک بیان کے معمولی یا غیر معمولی ہونے سے زیادہ اس کا درست ہونا اہم تھا۔ درستی کے تعین کے لیے وہ بنیادی مآخذ تک رسائی اور اُن کی چھان بین کو ضروری قرار دیتے تھے۔ ادبی معلومات کے حصول کے لیے ممکنہ اہم مآخذ تک رسائی اُن کی تحقیق کا بنیادی اصول تھا۔ اس اصول سے انحراف کا لازمی نتیجہ غلطی ہے۔ قاضی صاحب نے عملی تنقید میں اپنے وسیع مطالعے کی بدولت ایسی بہت اغلاط کی نشان دہی کر کے تصحیحات کیں۔ اس کے علاوہ غیر محتاط بیانات، تراجم کی غلطیاں اور اصول فن سے انحراف وغیرہ پر قاضی صاحب نے سختی سے گرفت کی۔

اردو میں تنقید کی روایت زیادہ تر ادبی تخلیقات سے متعلق ہے۔ ادبی فن پاروں کی تنقید میں عموماً اُن کے فکری و فنی محاسن، تفہیم، تشریح، تعبیر اور تحسین وغیرہ کا رجحان پایا جاتا ہے۔ حافظ محمود شیرانی کے بعد قاضی صاحب نے اردو میں تحقیق اور تنقید کو بھی ہدف تنقید بنا کر ادبی معلومات کی صحت اور بیان کی راست بازی کا خیال پیدا کیا۔ اُن کی تنقید کا ہدف تحقیق تھا، اور اس قسم کی تنقید میں انھوں نے تفہیم، تشریح اور تعبیر کی سختی سے مذمت کرتے ہوئے ”تنقیہ“ (معلومات کو عیب سے پاک کرنا) کو لازم قرار دیا۔ انھوں نے تنقید میں تنقیہ سے کام لے کر بیسویں

صدی کی اردو تحقیق کا قبلہ درست کیا۔ احمد ندیم قاسمی صاحب نے اردو تحقیق اور تنقید کی عمومی روایت کے متعلق لکھا تھا ”اردو تحقیق عام طور پر تنقید کی فکری گہرائی اور تنقید تحقیقی صحت سے بڑی حد تک محروم ہے۔“ قاضی صاحب کے تنقیدی تبصروں نے تنقید کو تحقیقی صحت عطا کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ اس مقصد کے لیے اغلاط کی نشان دہی ضروری تھا۔ وہ مسلسل بلا جھجک سخت لہجے میں اغلاط کی طرف توجہ دلاتے رہے۔ اسی وجہ سے اُن کے معاصرین نے اُن کی سخت گیری اور چشم نمائی کا گلہ کرتے ہوئے اُن کی تنقید کو ”اغلاط شماری“ ”منفی تنقید“ اور ”بے باک تنقید“ کا نام دیا۔ قاضی صاحب نے خطباتِ گارسیں دتاسی مرتبہ مولوی عبدالحق پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنا تنقیدی نقطہ نظر یہ پیش کیا:

”دتاسی نے اس کتاب میں کہیں لکھا تھا کہ کتاب اگرچہ بہ حیثیت مجموعی مفید ہو تو اس کے عیوب سے چشم پوشی کرنی چاہیے۔ ممکن ہے کہ انیسویں صدی میں تبصرہ نگاروں کا اس پر عمل ہو، لیکن بیسویں صدی میں تو تصویر کا صرف ایک رخ دکھانا، ادبی شریعت میں گناہِ عظیم سمجھا جاتا ہے اور ہمارے لیے باوجود اس کے کہ دتاسی کی بڑی عزت اور محبت ہمارے دل میں ہے، اس مشورے پر عمل پیرا ہونا ممکن نہیں۔“^(۱)

قاضی صاحب نے تنقید میں جانچ کے لیے تحقیق کو آلہ کار بنایا۔ وہ تنقید میں عمومیت کے قائل نہ تھے اور ہر بیان کو جانچ کر غلطی کی تصحیح کرتے تھے۔ اُن کے تنقیدی تبصرے بلا تمہید، تحریر کے مختصر تعارف کے بعد نکات کی شکل میں ہوتے تھے۔ تبصرے میں وہ سلسلہ نمبر کے ساتھ زیر نظر تحریر کے عیوب دکھاتے اور اُن کی اصلاح کرتے جاتے تھے۔ تنقید میں قاضی صاحب بھی تصویر کا ایک رخ ہی دکھاتے رہے۔ بہ قول ڈاکٹر عابد رضا بیدار اُن کا نقطہ نظریہ تھا کہ محاسن تو عموماً ظاہر ہی ہوتے ہیں، اغلاط کی طرف توجہ فوراً مبذول نہیں ہوتی اور اس کے لیے غیر معمولی محنت درکار ہوتی ہے۔ نقاد کا کام ہے کہ وہ اپنی غیر معمولی صلاحیت اور محنت سے ان امور کی طرف توجہ دلائے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے قاضی صاحب کی تنقیدی رویے کے متعلق لکھا: ”اس قسم کی تنقید کے لیے نہایت وسیع مطالعے اور علیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ اپنی پست سطح پر ”تنقیصی تنقید“ بن جاتا ہے اور اعلیٰ سطح پر فاضلانِ اجل کے لیے عبرت کا تازیانہ... چنانچہ قاضی مرحوم نے ایک زمانہ کا مزاج اسی تازیانے سے ٹھیک کر لیا۔“^(۲)

قاضی صاحب نے اردو تنقید کو تحقیقی اسلوب فراہم کیا۔ اُن کا خیال تھا کہ تنقید میں الفاظ کا واضح اور متعین معنوں میں استعمال کرنا بہت ضروری ہے۔ تنقید کی زبان تخلیق کی زبان سے مختلف ہے۔ تخلیقی ادب میں

آرائشِ زباں کے لوازمات (تشبیہ، استعارہ، مبالغہ، مجاز، تاثراتی اور جذباتی جملے وغیرہ) تحریر میں حسن پیدا کرتے ہیں لیکن تحقیق اور تنقید میں ان سے حقیقتِ حال کی پردہ پوشی کا کام لیا جاتا رہا ہے۔ تحقیق اور تنقید میں ان سے پرہیز لازم ہے۔ تخلیقی نثر کی طرز میں لکھی گئی تنقید تخلیقی شان کی حامل تو ہو سکتی ہے، حقیقت کی ترجمان نہیں بن سکتی ہے۔ نقاد کو چاہیے کہ لفظوں کا استعمال احتیاط اور کفایت شعاری کرے۔ تنقید میں غیر ضروری باتوں سے بچنا اور ضروری مطالب کو اختصار سے پیش کرنا ضروری ہے۔ دیوانِ عزلت کے مقدمے پر قاضی صاحب نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

”متنِ دیوان ۲۲۳ صفحات میں آیا ہے اور مقدمہ ۱۸۲ صفحات کا ہے۔ چونکہ دیوان میں ایسے اشعار جو دو سطروں سے کم میں آئے ہوں مقابلہ بہت کم ہیں، تعداد الفاظ مقدمے میں زیادہ ہو تو عجب نہیں۔ کیمرج کے ایک معلم انگریزی جو اسلوبِ بیان پر ایک قابلِ قدر کتاب کے مصنف ہیں، طویل بے جا سے کام لینے والوں کے لیے یہ سزا تجویز کرتے ہیں کہ وہ اپنی تحریر کو بذریعہ تار اپنے خرچ سے بھیجنے پر مجبور کیے جائیں۔ یہ تو انہونی ہے، لیکن فضول گوئی سے بچنے کی کوئی صورت نکل سکتی تو بہت اچھا ہوتا۔“ (3)

قاضی صاحب نے تنقید میں سخت لب و لہجے اور طنز سے کام لیا۔ ان کے خیال میں تنقید کا منصب اسی لہجے کا تقاضا کرتا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے ان کے انداز اور لب و لہجے کے نتائج کے بارے میں ذاتی رائے پیش کرتے ہوئے لکھا: ”یہ ضروری ہے کہ اغلاط کی نشان دہی میں احساسِ برتری یا طنز و تمسخر کا شائبہ نہ ہو۔ غلطی کون نہیں کرتا، اغلاط کی طرف ہمدردی و دل سوزی کے ساتھ اشارہ کیا جائے، تو اصلاح ہوگی۔ چھتے ہوئے الفاظ میں وہی بات کہی گئی تو مشار“ علیہ چڑ کر اپنی بات پراڑ جائے گا۔ گویا انشائیہ کا حق ادا ہو جائے گا لیکن اعتراض کا مدعا خبط ہو جائے گا۔“ قاضی صاحب نے اس بیان پر ردِ عمل کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

”اگر کوئی اس مشورے پر عمل کرنا چاہے، تو کتاب خواہ کتنی ہی اغلاطِ فاش سے مملو کیوں نہ ہو، اس پر تبصرے کا آغاز کچھ اس طرح کرے: ”جناب والا کو نہایت ادب سے اطلاع دی جاتی ہے کہ جناب والا کی کتاب (نام) میں بکثرت اغلاطِ فاحش نظر آتے ہیں۔ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ جناب والا سے یہ غلطیاں سرزد ہوئی ہوں، کاپی اور پروف کی تصحیح کا کام جن صاحب کے سپرد ہوا، ظاہراً کثرتِ مشاغل کی وجہ سے، وہ اس کے لیے کافی وقت نہ نکال سکے۔ جناب والا اس سے بے خبر نہ ہوں گے کہ اس ملک میں حاسدوں کی کمی نہیں۔ وہ موقع کی تاک میں رہتے ہیں اور چھاپے کی غلطیوں کو لکھنے والے کی غلطیاں قرار دینے میں انھیں مطلقاً تامل نہیں ہوتا۔ احقر کا باادب مشورہ ہے کہ آئندہ تصحیح کا کام

ایسے لوگوں کے سپرد ہو، جو اس کے لیے وقت نکال سکیں۔ مضمون نگار نے شاید شوپنہار کا یہ قول نہیں سنا کہ بروں کو بُرا نہ کہنا اچھوں کے ساتھ زیادتی ہے اور وہ بظاہر اس سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں کہ میتھو آرنلڈ نے انگلستان کا المانیہ سے مقابلہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان دونوں ملکوں میں علمی مباحث کی سطح، انگلستان سے اس لیے بلند ہے کہ وہاں مقابلہ سخت گیری زیادہ ہوتی ہے۔ ہندوستان میں نرمی کی نہیں سختی کی ضرورت ہے، بلکہ بہتوں سے طنزیہ الفاظ میں نہیں صاف صاف کہہ دینا چاہیے کہ تحقیق آپ کے بس کا روگ نہیں، آپ کو کوئی اور کام کرنا چاہیے۔ بہتوں کا دماغ جھوٹی تعریف نے خراب کر دیا ہے، وہ محققین کی صفِ فعال بیٹھنے کا حق نہیں رکھتے، لیکن وہ اپنے کو صفِ اولین میں ایک ممتاز مقام کا سزاوار سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنی اصلاح کیا کریں گے؟ کتنے ہی نرم الفاظ میں اغلاط کی نشان دہی کیوں نہ ہو، وہ معترض کے دشمن ہو جاتے ہیں۔" (4)

قاضی عبدالودود تحقیقی تنقید کے علم بردار تھے۔ انھوں نے اردو میں مغربی اندازِ تنقید (بیانات کے معروضی جائزے) کو متعارف کرایا۔ تنقید میں وہ انیسویں صدی کے معروف فرنیچ نقاد سینٹ بو کو پسند کرتے تھے۔ سینٹ بو نے اظہارِ رائے کی آزادی کو نقاد کا بنیادی حق قرار دیتے ہوئے معاصرین کی تحریروں پر بے لاگ تنقید کی روایت ڈالی۔ قاضی صاحب نے اپنے مخصوص معروضی اندازِ بیانات میں اردو تحقیق پر اس روایت کا اطلاق کیا۔ ان کے تبصرے نکات کی شکل میں ہیں۔ انھوں نے اپنی تنقیدی رائے کا اظہار کم سے کم ایک سطر اور زیادہ سے زیادہ دو سو بائیس صفحات پر مشتمل طویل مقالے میں کیا۔ قاضی صاحب نے تنقید کا باضابطہ آغاز اپنے جاری کردہ رسالے "معیار" ہائی پور ۱۹۳۶ء سے کیا۔ "معیار" میں انھوں نے تحقیقی کتب کے علاوہ اہم رسائل میں شائع ہونے والے ادبی اور تحقیقی مضامین پر مختصر تبصرے لکھے۔ اُس دور میں ان کی تبصرہ نگاری کا انداز یہ تھا کہ وہ اہم مضامین کی معلومات کو ملخص اشارات کی صورت میں تبصرے کا حصہ بنا کر غلطیوں اور نارسائیوں کی طرف اشارہ کر دیتے تھے۔ معیار میں شائع ہونے والے تین مختصر ترین تبصرے ملاحظہ کیجیے:

نیرنگ خیال کے مضامین: "تحقیقی مضامین میں سب سے بہتر خضر خاں اور دول دیوی

سے متعلق سید حسن برنی صاحب کا مضمون ہے۔" معیار: ص ۱۲۲

سہیل (علی گڑھ): "ادب کے متعلق جو تحقیقی مضامین شائع ہوئے ہیں، ان میں ڈاکٹر

عبدالستار صدیقی کے مضمون کو چھوڑ کر کسی کا پایہ بلند نہیں۔" ص ۲۳۹

سہیل (علی گڑھ): "ناقدانہ مضامین میں ڈاکٹر حسین کا مضمون اچھا

ہے۔" ص ۲۳۹

معیار میں شامل تنقیدات کے علاوہ اُن کے درج ذیل دس تنقیدی مجموعے شائع ہوئے۔

- ۱۔ غالب بحیثیت محقق؛ علی گڑھ میگزین غالب نمبر: ۱۹۳۹ء؛ خدا بخش اور نیشنل پبلک لائبریری پٹنہ، ۱۹۹۵ء
- ۲۔ محمد حسین آزاد بحیثیت محقق: ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ: ۱۹۸۴ء
- ۳۔ مولوی عبدالحق بحیثیت محقق: خدا بخش اور نیشنل پبلک لائبریری، پٹنہ: ۱۹۹۵ء
- ۴۔ گارساں دتاسی: خدا بخش اور نیشنل پبلک لائبریری، پٹنہ: ۱۹۹۵ء
- ۵۔ فرہنگ آصفیہ پر تبصرہ: خدا بخش اور نیشنل پبلک لائبریری، پٹنہ: ۱۹۸۱ء
- ۶۔ اشتر و سوزن: کوہ نور مکتبہ، دہلی: ۱۹۶۴ء
- ۷۔ عیارستان: ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ: ۱۹۶۷ء
- ۸۔ تبصرے: خدا بخش اور نیشنل پبلک لائبریری، پٹنہ: ۱۹۹۵ء
- ۹۔ اردو میں ادبی تحقیق کے بارے میں خدا بخش اور نیشنل پبلک لائبریری، پٹنہ: ۱۹۹۵ء
- ۱۰۔ مقالات قاضی عبدالودود: بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ: ۱۹۷۷ء

غالب بحیثیت محقق

غالب سے قاضی عبدالودود کو بے حد محبت تھی۔ اُن کے یہ قول انھیں غالب کا تقریباً سارا کلام یاد تھا۔ اُنھوں نے غالب سے متعلق ہر چیز، ہر واقعے، ہر تحریر، ہر لفظ، کو تحقیق کا موضوع بنایا اور اس تحقیقی سلسلے کو "جہانِ غالب" کے عنوان سے شائع کیا۔ فارسی زبان و ادب اور لغات سے وابستگی کا بنیادی محرک بھی غالب تھے۔ قاضی صاحب کی غالب سے برہمی کا بنیادی سبب غالب کا یہ دعویٰ تھا کہ: "میں نے فارسی تحقیق کو اُس پایے پر پہنچایا کہ اس سے بڑھ کر متصور نہیں" (خطوط: ۱۹۱)۔ قاضی صاحب نے "غالب بحیثیت محقق" کے لکھا:

"افسوس کی جگہ ہے کہ غالب نے یہ محسوس نہیں کیا کہ اُن کی شاعری، اُن کی انشا پر دازی اور اُن کی ظرافت انھیں زندگی جاوید بخشنے کے لیے کافی ہے اور ایسے کام میں ہاتھ ڈالا جس کے لیے نہ وہ طبعاً موزوں تھے، اور نہ جس کے لیے اُنھوں نے کچھ زیادہ تیاری کی تھی۔ غالب اپنی زبان سے اپنے کو محققِ اکمل اور ہمہ دانِ عدیم النظر کہیں اور اپنے منہ عن الخطا ہونے کا اعلان کریں۔ اُن کے مداح انھیں شہنشاہِ ممالک علوم عربی و فارسی کا لقب دیں۔ لیکن اُن کے معلومات اتنے قلیل، اُن کے اغلاط اتنے مختلف النواع اور

کثیر التعداد ہیں کہ بزمِ محققین کی صفِ فعال میں بھی اُن کے لیے جگہ نکالنی مشکل ہے۔“ (5)

”غالب بحیثیت محقق“ قاضی صاحب کا طویل ترین تنقیدی تبصرہ ہے۔ اس کی پہلی اشاعت علی گڑھ میگزین ۱۹۴۹ء میں ہوئی۔ اس تبصرے کا نقشِ اول بارہ فصلوں اور بیالیس پر محیط تھا۔ اس کے ردِ عمل میں ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ”اردو ادب“ علی گڑھ جنوری ۱۹۵۲ء میں ”ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں“ کے عنوان سے مقالہ لکھ کر قاضی صاحب کے دلائل کو یکسر رد کیا۔ اس نقدِ انتقیدی کی روشنی میں قاضی صاحب نے مقالے کو از سرِ نو چودہ عنوانات کے تحت ترتیب دے کر دو سو بائیس صفحات پر مشتمل کتابی شکل میں شائع کیا۔ یہ قاضی صاحب کا طویل ترین تنقیدی مقالہ ہے۔ اس مقالے کی اشاعتِ سوم میں مرتب نے غالب سے متعلق قاضی صاحب کے دیگر مضامین ”غالب کی راست گفتاری“، ”غالب کا ایک فرضی استاد، عبدالصمد“ اور ”فرہنگِ غالب“ کو بھی شامل کیا۔ یہ مجموعہ تین سو اڑتیس صفحات پر مشتمل ہے۔

غالب بحیثیت محقق میں قاضی صاحب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ غالب محقق نہیں تھے۔ جھوٹ، خود پرستی، ضعفِ حافظہ، ناتواں بینی، بے پروائی، سہل انگاری، ضد اور اوجاجِ ذہن اُن کی انسانی کمزوریاں تھیں۔ جن طبائع میں یہ خصوصیات پائی جائیں وہ محقق نہیں ہو سکتیں۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے قاضی صاحب نے غالب کے خطوط سے شخصی زندگی کے حقیقی خطوط ابھارے اور قاطع برہان [۱۸۶۲ء] کے تنقیدی جائزے سے اُن کی محققانہ بصیرت کی قدر بیانی کی۔ مثال کے طور پر ”غالب کی راست گفتاری“ کو لیجیے۔ غالب نے ایک خط میں اپنے متعلق لکھا: ”میں جھوٹ سے بیزار ہوں، اور جھوٹے کو ملعون جانتا ہوں اور کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔“ (اردوئے معلیٰ: ص ۳۰) غالب کے اس بیان کو اُن کے سوانح نویسوں اور محققین نے بلا تامل تسلیم کرتے ہوئے، راست گفتاری کو غالب کی ایک خصوصیت قرار دیا۔ قاضی صاحب نے اس مضمون میں غالب کی راست گفتاری سے متعلق مولانا حالی، مولانا غلام رسول مہر اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے بیانات نقل کیے اور پھر خطوطِ غالب سے دروغ گوئی کی انیس (۱۹) مثالیں پیش کیں۔ آخری دلیل حسین مرزا کے نام غالب کے خط کی درج ذیل عبارت ہے جس میں جھوٹ کا اقرار بھی کیا گیا ہے:

”ابھی تمہارا قرض خواہ آیا تھا، کچھ سچ، کچھ جھوٹ کہہ کر اُس کو راہ پر لایا ہوں کہ سو دو سو

روپے تم کو بھیج دے۔“ (اردوئے معلیٰ: ص ۲۴۱)۔

ایرانِ قدیم سے متعلق غالب کو محققانہ واقفیت کا دعویٰ تھا۔ بہ قول حالی غالب نے فارسیوں کے مذہبی خیالات اور اسرار ملا عبد الصمد سے سیکھے تھے۔ قاضی صاحب نے متذکرہ مضمون میں دلائل سے ملا عبد الصمد کو غالب کی ذہنی مخلوق قرار دیا۔ یوں تحقیق میں غالب کا پایہ اعتبار از خود بے بنیاد ہو گیا۔ اسی بنا پر قاضی صاحب نے لکھا کہ ” غالب کو سچی باتیں کہنے کا اتنا شوق نہیں تھا جتنا نئی باتیں کہنے کا۔“ اس حصے میں قاضی صاحب نے تاریخ سے متعلق غالب کی فروگزاشتیں دکھائیں۔ اس مقالے کا طویل حصہ غالب کے فارسی زبان و ادب سے واقفیت کے جائزے پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں قاضی صاحب نے سو سے زائد فارسی الفاظ کی بابت غالب کے خیالات کو بے تحقیق، بے بنیاد، مبہم اور غلط قرار دیا۔ اس کے علاوہ فارسی ادب سے متعلق متنوع تسامحات دکھائے۔ قاضی صاحب کے اعتراضات کی تین مثالیں ملاحظہ کیجیے:

”غالب عود: ص ۵۸ میں رقمطراز ہیں: صائب اگرچہ اصفہانی نژاد تھا مگر وادِ شاہ جہاں آباد تھا۔ انتقام کشیدن و انتقام گرفتن دونوں بول گیا: یہ واضح نہیں کہ غالب ان دونوں میں سے سکے ہندی روزمرہ کا ترجمہ سمجھتے ہیں، مگر اس بنا پر کہ مقدم الذکر کے اسناد مؤخر الذکر کے مقابلے میں بہت زیادہ ملتے ہیں، یقین ہے کہ وہ انتقام گرفتن ہی کو اصیل فارسی نہ قرار دیتے ہوں گے۔ لیکن انتقام کی فارسی، زوزنی، بستی، بہستی، کنز و صراح میں کینہ ہے اور یہ کشیدن اور گرفتن دونوں کے ساتھ مستعمل ہے۔ (باد شمنناں ماکینہ گرفتی، بلعی ص ۱۴۴)۔“ غالب بحیثیت محقق: ص ۵۱

۲۔ ”شاہ نامہ فردوسی کسی نہ کسی حد تک غالب نے پڑھا ہوگا، مگر اس کے متعلق اُن کے بیشتر بیانات صحت سے دور ہیں۔“ ص ۳۹

۳۔ ”حافظ کا دیوان کس نے نہیں دیکھا جو غالب کی نظر سے نہ گزرا ہو۔ لیکن غالب نے اُن کا ایک مشہور شعر جامی کے نام لکھ کر اس دعوے کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ قائل نے قافیوں میں غلطی کی ہے۔“ ص ۴۱

غالب لغت کے باب میں اپنے سوا کسی ہندوستانی کو یہاں تک کہ ایرانیوں کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے، اُن کا دعویٰ تھا:

”اس زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر۔ اہل پارس میں اور مجھ میں دو طرح کی تفاوت ہے ایک تو یہ کہ اُن کا مولد ایران اور

میرا ہندوستان، دوسرے یہ کہ وہ لوگ آگے پیچھے سو دو سو چار سو آٹھ سو برس پہلے پیدا ہوئے ہیں۔“ (6)

اسی بنا پر غالب نے محمد حسین برہان کے لغت برہان قاطع [۱۶۵۲ء] پر تنقیدی رسالہ قاطع برہان [۱۸۲۲ء] لکھا۔ اس رسالے میں غالب نے جامع لغت پر خلاق الفاظ اور تصنیف کے الزامات عائد کیے اور اُن کے طریق کار کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔ قاضی صاحب نے لغت کے تاریخی پس منظر میں قاطع برہان کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے یہ نتائج اخذ کیے کہ غالب کے بہت سے اعتراضات بے بنیاد، غلط اور اصول لغت نگاری سے عدم واقفیت کی بنا پر تھے۔ اُن کے درست اعتراضات صرف صاحب برہان پر نہیں بل کہ اُن کے معاصرین اور مابعد کے لغت نگاروں پر بھی عائد ہوتے ہیں۔ غالب نے لغات کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا تو اس نوع کے اعتراضات صرف صاحب برہان پر عائد نہ کرتے اور برہان کے بہت سے لغات کو مؤلف کے تراشیدہ قرار نہ دیتے۔

محمد حسین آزاد بحیثیت محقق

آپ حیات مولانا محمد حسین آزاد کی زندہ تالیف ہے۔ اس کے لافانی اسلوب بیان نے اس کا مرتبہ تصنیف سے بھی بڑھا دیا۔ تاہم تاریخ اور تذکرہ صحت کی متقاضی تصانیف ہیں۔ آپ حیات کی اشاعت اول [۱۸۸۰ء] کے بعد نواب ضیال الدین خاں نے نسب کی بعض غلطیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے اس پر اصلاحی تنقید کا آغاز کیا۔ اردو شاعری اور شاعروں پر باضابطہ تحقیق سے حکیم عبداللہ، شیخ چاند، مولانا حبیب الرحمن شروانی، مولوی عبدالحق اور میر محمد رضا وغیرہ نے آپ حیات کی بعض اور غلطیوں کی طرف توجہ دلائی۔ حافظ محمود شیرانی نے ۴۲-۱۹۴۱ء میں آغا محمد باقر کی فرمائش پر آپ حیات پر باقاعدہ تنقیدی مقالات ”تنقید برآپ حیات“ اور ٹینٹل کالج میگزین میں شائع کیے۔ آغا صاحب کی ناخوشی کو دیکھتے ہوئے یہ سلسلہ تین اقساط سے آگے نہ بڑھ سکا۔ تینوں مقالات میں مجموعی طور پر حافظ محمود شیرانی نے چوالیس غلطیوں کو ثابت کیا۔ قاضی صاحب نے ۴۳-۱۹۴۲ء میں اس تنقیدی سلسلے کو ”محمد حسین آزاد بحیثیت محقق“ کے عنوان سے توسیع دی۔ اس مقالے کی تین اقساط ہیں ہر قسط سوا اعتراضات پر مشتمل ہے۔ مجموعی طور پر یہ طویل مقالہ تین سوا اعتراضات پر مبنی ہے۔ پہلی قسط آپ حیات پر جب کہ دوسری اور تیسری قسط میں دیوان ذوق مرتبہ آزاد، سخن دان فارس اور نگارستان پر تنقید ہے۔ قاضی صاحب نے آزاد سے مروی ایک سوراہات کی تغلیط کی۔ اشعار اور تصانیف کے پچیس غلط انتسابات کی نشان دہی کی۔ شعر کے نام، سال ولادت، وطن، وفات اور سفر سے متعلق پچاس معلومات کو غلط قرار دے کر درست صورت کا تعین کیا۔ مادہ تاریخ سے سنین کے استخراج کی پندرہ

غلطیاں دکھائیں۔ علاوہ ازیں اعتراضات تاریخی معلومات، غلط بیانات اور متفرق اغلاط کی نشان دہی سے متعلق ہیں۔ آزاد بحیثیت محقق کی چند ابتدائی مثالیں بہ طور نمونہ دیکھیے:

۱۔ ”خالق باری کو امیر خسرو سے منسوب کیا ہے اور بی چو (ساقن) کی زبان سے کیا ہے۔ ”بھٹیاری کے لڑکے کے لیے خالق باری لکھ دی۔ ذرا لونڈی کے نام پر بھی کچھ لکھ دو گے تو کیا ہو گا؟“ الف ص ۶۷۔ خالق باری جیسا کہ شیرانی کی تحقیقات نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے، امیر خسرو سے کچھ تعلق نہیں رکھتی۔ آزاد کے زمانے میں یہ بات کہ امیر خسرو اس کے مصنف ہیں، شہرت عام رکھتی تھی۔ اس لیے آزاد اسے باور کرنے کے لیے زیادہ قابل الزام نہیں، لیکن بھٹیاری والی حکایت خود ان کی بنائی ہوئی ہے۔ ص ۱

۲۔ ”خسرو بی چو کے یہاں حقہ پیا کرتے تھے۔ الف ص ۶۷۔ تنباکو خسرو کے زمانے میں ہندوستان میں نہ تھا اور یہ بات عام طور پر معلوم ہے۔ حقے سے کچھ اور مراد ہے تو آزاد کو اس کی وضاحت کرنی تھی۔ ص ۱

۳۔ ”ولی کا ابتدائی عہد شاید عالم گیر کا آخری زمانہ ہو گا۔“ الف ص ۹۲۔ ولی کا سال ولادت نامعلوم ہے مگر اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ ان کی وفات ۱۱۱۹ھ میں ہوئی (رجوع بہ ولی گجراتی مصنفہ جناب ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی ص ۸۱)۔ عالمگیر ۱۱۱۸ھ میں فوت ہوا ہے۔ آزاد کا قول صریحاً غلط ہے۔ ص ۲

۴۔ ”دل ولی کالے لیا دلی نے چھین جا کہو کوئی محمد شاہ سو“ الف ص ۹۳ میں ہے کہ ولی ”کبھی کبھی حافظ کی طرح بادشاہ وقت کے نام سے شعر کو شان و شکوہ دیتے تھے۔ ولی کی تصنیفات میں سے ایک غزل میں کہتے ہیں: دل ولی الخ“ ولی کی وفات ۱۱۱۹ھ میں ہوئی تھی تو ظاہر ہے کہ اس کے کسی شعر میں محمد شاہ کا نام نہیں آسکتا۔ اس لیے کہ اُس کا سال جلوس ۱۱۳۱ھ ہے۔ شعر کا مصرع یوں ہے: ”اس گدا کا دل لیا دلی نے چھین“ اور یہ مضمون کا ہے (گلشنِ گفتار ص ۱۹، چمنستان شعرا ص ۳۵۷)۔ ص ۲

آپ حیات اور محمد حسین آزاد کے ادبی مقام کی بدولت تنقید کے ساتھ حمایت کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ کچھ عرصہ پہلے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے مجلہ ”تعبیر“ دسمبر ۲۰۱۶ء میں ڈاکٹر ابرار عبدالسلام نے ”آزاد کی حمایت میں“ مضمون لکھ کر آزاد کی تینیں اغلاط کے بارے میں جواز پیش کیا کہ آزاد کے بجائے وہ ماخذا اور مصنفین مورد الزام ہیں جہاں سے انھوں نے معلومات حاصل کیں۔

مولوی عبدالحق بحیثیت محقق

قاضی عبدالودود مولوی عبدالحق کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ قاضی صاحب انجمن ترقی اردو کی شاخ بانگی پور (پٹنہ) کے سیکرٹری تھے۔ بیسویں صدی کے چوتھے عشرے میں ”اردو ہندی، ہندوستانی“ کا تنازع رونما ہوا تو راجندر پرشاد (پیکٹ) معاہدے کے تحت مولوی عبدالحق زبان کے نام کی تبدیلی پر متفق ہو گئے۔ قاضی صاحب اس بات پر اُن سے ناراض ہوئے اور دونوں کے درمیان فاصلے بڑھتے چلے گئے۔ تاہم قاضی صاحب اردو اور انجمن ترقی اردو کے زبردست حامی تھے، انھوں نے انجمن کی مطبوعات کے معیار کو بلند کرنے کے لیے اپنے جاری کردہ رسالے ”معیار“ [۱۹۳۶ء] میں اُن پر تنقیدی سلسلہ شروع کیا۔ معیار میں قاضی صاحب نے مولوی عبدالحق کے چھ مرتبہ متون [ذکر میر، انتخاب کلام میر، نکات الشعرا (تذکرہ)، گلشن ہند (تذکرہ) تذکرہ شعراے اردو اور عقدِ ثریا (تذکرہ) پر تنقیدی تبصرے لکھے۔ یہی تبصرے بعد میں رسالہ معاصر پٹنہ میں ”مولوی عبدالحق بحیثیت محقق“ کے عنوان سے ۵۹-۱۹۵۸ء میں شائع ہوئے۔ ان تبصروں کی انفرادیت یہ ہے کہ قاضی صاحب نے مرتب اور مصنفین دونوں کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا۔ پہلے تین تبصروں میں قاضی صاحب نے میر کے متعدد بیانات اور مرتب کی تسامحات کی نشان دہی کی۔ ان تبصروں کی بدولت قاضی صاحب نے باضابطہ طور پر میر کی شخصیت اور فن کو موضوع تحقیق بنا کر میر سے متعلق بہت سی معلومات کی اصلاح کی۔ ذکرِ میر، میر کی آپ بیتی ہے اور آپ بیتی کی معلومات کے بارے میں عموماً شک و شبہ نہیں کیا جاتا۔ ذکرِ میر مرتب کرتے وقت مولوی عبدالحق نے اسی خیال سے میر کے بیانات کو من و عن پیش کیا۔ لیکن قاضی صاحب نے میر کے بہت سے بیانات کو ذاتی حالات اور معاصر تاریخ کی کسوٹی پر جانچ کر غلط قرار دیا۔ قاضی صاحب نے میر کی سیادت، والد کی درویشی اور دادا کی نواحِ اکبر آباد میں فوجداری وغیرہ جیسی بنیادی معلومات کو غلط قرار دیا۔ ذکرِ میر میں میر کے بیانات پر تنقید کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

۱۔ ”نصرت یار خاں (بارہہ) صوبہ دار اکبر آباد احسان اللہ خاں کی ”پابوسی“ کی سعادت حاصل کرنے آتا ہے اور نذر پیش کرتا ہے۔ اس وقت امان اللہ اور میر حاضر تھے۔ احسان اللہ تھوڑی ہی دیر کے بعد نصرت یار خاں کو یہ کہہ کر رخصت کر دیتا ہے: ”حالا برو کہ یار عزیز (امان اللہ) شیشہ جاں، نازک مزجت و من پاسداری ایں مرد لا علاج“ ص ۳۳، ۳۲۔ مقصد ظاہر ہے مگر نصرت یار خاں جو نائب صوبہ دار تھا، ولادت میر سے قبل ہی فوت ہو چکا تھا۔ (تاریخ محمدی و تاریخ کامور خاں)

۲۔ ”میر نے اپنے دادا کو فوجدار گرد اکبر آباد لکھا ہے ص ۴۔ اُن کے عہد کی تاریخ میں فوجدار ان اکبر آباد کے نام ملتے ہیں، لیکن کوئی نام ایسا نہیں جس کی نسبت یہ احتمال ہو کہ یہ میر کے دادا کا ہے۔ خود میر نے نام دینے سے گریز

کیا ہے۔ میر کا بھتیجا اور شاگرد، محسن محاکمات الشعرا کے دیباچے میں (نسخہ کتب خانہ دانشگاه پنجاب) میں اپنے متعلق لکھتا ہے: ”فقیر محمد محسن (میر محمد محسن نہیں) ولد قدوة الفضلا، رئیس الفقرا حافظ محمد حسن (میر محمد حسن نہیں) اکبر آبادی کہ از فرزندان... و شاگرد و نبیره حضرت آرزو مست“، اگر اس کے پردادا واقعی فوجدار ہوتے تو، تو وہ اس موقع پر ضرور اُن کا ذکر کرتا، یہ معمولی عہدہ نہ تھا (شاہ زادوں کو بھی ملا کرتا تھا) اس امر سے کہ وہ اپنے پردادا کے ذکر کی ضرورت نہیں سمجھتا، اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ فوجداری کا بیان محض داستان طرازی ہے۔“

۳۔ ”ذکر میر میں آرزو سے علمی و ادبی استفادے کا ذکر نہ ہونا اور دوسروں کے تلمذ کا اقرار، آرزو کی شاگردی سے انکار کے برابر ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو نکات الشعرا میں غلط بیانی سے کام لیا ہے اور نکات الشعرا میں استاد و پیرو مرشد کہنا صحیح ہے تو ذکر انکار غلط ہے۔“

مولوی عبدالحق نے اردو ادب اپریل ۱۹۲۶ء میں میر کے حالات پر ایک مقالہ لکھا تھا۔ ذکر میر مرتب کرتے وقت اسی مقالے کو تمہید مقدمہ بنا کر ذکر میر کا اردو خلاصہ بھی شامل کیا گیا۔ قاضی صاحب نے تبصرے کے دوران اس خلاصے میں ترجمے کی تینتیس غلطیوں کی طرف توجہ دلا کر اصلاح کی۔ ترجمے پر تنقید کی چند مثالیں دیکھیے:

۱۔ فارسی داں جانتے ہیں کہ فارسی میں عم اور عمو کی طرح خالہ اور خالو میں فرق نہیں اور فارسی سے اردو میں ترجمہ کریں گے یا فارسی مطالب اردو میں پیش کریں گے تو پہلے یہ دیکھ لیں گے کہ خالو کس طرح آیا ہے۔ ذکر میر میں یہ تین شخصوں کے لیے مستعمل ہوا ہے اور یہ تینوں شوہر خالہ نہیں، ماموں تھے۔ انتظام الدولہ (عماد الملک اُن کا خواہر زادہ، ذکر ص ۷۲) سالار جنگ (آصف الدولہ کا بھانجا، ذکر ص ۱۳۹) آرزو (میر کی سوتیلی ماں کے بھائی، صفحات ۶، ۷، ۵، وغیرہ) ڈاکٹر عبدالحق نے انتظام الدولہ و عماد الملک کے رشتے کا تو ذکر ہی نہیں کیا۔ سالار جنگ کو آصف الدولہ (ص ۲۴۶) اور آرزو کو میری اُن کے بھائی (صفحات: ۲۰۷، ۲۰۹، ۲۱۲، ۲۳۶، ۲۱۳) کا خالو لکھا ہے۔ اردو میں خالو صرف شوہر خالہ کو کہتے ہیں۔ فارسی خالو کی جگہ اردو میں خالو لانا اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے کہ فارسی میں واقعی شوہر خالہ مراد ہو۔“

۲۔ ”تاریخ ہند کے ابجد خواں بھی اس سے ناواقف نہ ہوں گے کہ عالمگیر ثانی بہادر شاہ کا پوتا تھا اور ذکر میر ص ۷۴ میں اُسے نبیره بہادر شاہ کہنا صحیح ہے، لیکن ڈاکٹر عبدالحق کا اُسے نواسہ لکھنا کسی طرح روا نہیں۔ فارسی میں نبیره اور نواسہ کے معنی میں فرق نہیں، دونوں بیٹے بیٹی کی اولاد کے لیے آتے ہیں۔ اردو میں نبیره اپنی جگہ پر رہا لیکن نواسہ بیٹی کے بیٹے کے لیے مخصوص ہو گیا ہے۔“

۳۔ ”میر کے دادا اکبر آباد کی فوجداری پر سرفراز ہوئے“ ص ۲۰۰ = ”بفوجداری گردا اکبر آباد سرفراز گشت“ ص ۲ گرد سے نواح مراد ہے۔

۴۔ ”نواب بہادر کے کارخانے میں تلاش روزگار کی“ ص ۲۲۱ = ”تلاش روزگار بخانہ نواب کردم“ خانہ و کارخانہ ایک نہیں ہیں۔

ذکر میر کی طرح مولوی عبدالحق کے دیگر مرتبہ متون پر بھی اسی نوع کے تبصرے لکھے گئے۔ تاریخی مآخذ خاص طور پر تذکروں اور تاریخ سے قاضی صاحب کو غیر معمولی مزاولت تھی۔ اشعار، شعر اور ان سے متعلق متنوع تواریخ ان کے حافظہ میں جذب ہوتی تھیں۔ کہیں کسی کے متن کو غلط پیش کیا یا نام، وطن، پیدائش، وفات، تلمذ، سفر حضر وغیرہ سے متعلق کوئی بات غلط لکھی تو وہ فوراً اصل مآخذ کی روشنی میں اس کی اصلاح کو ضروری سمجھتے تھے۔ تنقید میں ان کا بڑا کارنامہ بنیادی مآخذ کو جرح و تعدیل کی کسوٹی پر پرکھنا ہے۔ انھوں نے بہت سے بنیادی مآخذ: آپ بیتیوں، تذکروں، تاریخوں اور دواوین وغیرہ کی مہیا کردہ معلومات کو دیگر ذرائع سے غلط قرار دیتے ہوئے صحیح صورت کا تعین کیا۔ ”مولوی عبدالحق بحیثیت محقق“ کے عنوان سے شائع ہونے والے ان تبصروں سے جہاں بہت سی تاریخی معلومات کی اصلاح ہوئی وہاں اردو میں تدوین کا معیار بھی بلند ہوا۔

قاضی صاحب کے تنقیدی مجموعوں میں شامل نمایاں تبصروں کو اصناف وار تقسیم کیا جائے تو یہ آسانی درج ذیل نوحصوں کے تحت دیکھے جاسکتے ہیں:

آپ بیتی: ذکر میر مصنفہ میر: شاد کی کہانی شاد کی زبانی از شاد عظیم آبادی: میری کہانی میری زبانی مصنفہ میر سٹر سید ہمالیوں مرزا۔

تاریخ: آزاد بحیثیت محقق: وقائع عالم شاہی مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی بہار تاریخ ادب اردو مرتبہ ادارہ ادبیات حیدرآباد بہار تاریخ ادبیات اردو مصنفہ ڈاکٹر محمد صادق بہار تاریخ صحافت مصنفہ امداد صابری اور سیاست ملیہ مصنفہ محمد امین زبیری۔

تحقیق و تدوین: مولوی عبدالحق بحیثیت محقق: رہبر تحقیق از شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی۔ تذکرہ مخدوم جہانیاں مؤلفہ سخاوت مرزا: مرقع شعر از ڈاکٹر رام بابو سکسینہ: شکار نامہ مرتبہ ڈاکٹر ثمنینہ شوکت: نور المعرفت از ولی مرتبہ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی: دیوان فائز مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب: دیوان عزلت مرتبہ عبدالرزاق قریشی: دیوان یقین مرزا مرتبہ فرحت اللہ بیگ: انشائے داغ مرتبہ احسن مارہروی: خطوط اکبر مرتبہ مختار الدین آرزو:

شیم عشرت مصنفہ سید احمد علی عشرت: مکاتیبِ سرسید احمد خاں مرتبہ مشتاق حسین: مکاتیبِ غالب مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی

تحقیق و تنقید: میر تقی میر حیات اور شاعری مصنفہ خواجہ احمد فاروقی: ذکرِ غالب از مالک رام: میر محمد مومن مؤلفہ ڈاکٹر سید محی الدین زور: بہادر شاہ اور اُن کا عہد مصنفہ رئیس احمد جعفری: امیر مینائی مصنفہ شاہ ممتاز علی آہ میٹھوی: اصلاحاتِ اقبال مؤلفہ بشیر الحق دستوی عظیم آبادی: شوق نیوی کے سوشلر منتخبہ فوقانی نیوی: چھان بین از اثر لکھنوی

رسائل: نیرنگ خیال: سہیل (علی گڑھ): اردو ادب (علی گڑھ): ہمایوں (لاہور): شاہکار (لاہور): ادبی دنیا (لاہور)۔

ادبِ لطیف (لاہور) وغیرہ

تراجم: جواہر العلوم مصنفہ طنطاوی مترجمہ عبدالرحیم: محمد الرسول اللہ ﷺ مصنفہ کار لائل مترجمہ عبدالرحمن عاقل: افکارِ عصریہ مصنفہ چارلس گبسٹن مترجمہ محمد نصیر احمد عثمانی۔

تحقیقی مقالات: لکھنؤ کا دبستانِ شاعری از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی: دہلی کا دبستانِ شاعری از ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی: بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا ۱۸۵۷ء تک از ڈاکٹر سید اختر اور نیوی: مرزا محمد علی فدوی اور اُن کا عصر، حیات شاعری اور کلام از ڈاکٹر سید حسنین: مثنویاتِ راسخ مرتبہ ڈاکٹر ممتاز احمد۔

لغات: فرہنگِ آصفیہ پر تبصرہ: لغاتِ گجری مرتبہ سید نجیب اشرف ندوی: فرہنگِ غالب مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی۔

متفرق کتب: انوار مصنفہ اختر علی اختر: ہماری زبان از سرسید بہادر سپرو: گلگرسٹ اور اُس کا عہد مصنفہ محمد عتیق صدیقی: بلقان از حفیظ صدیقی: شیخ نیازی مصنفہ رشید احمد صدیقی: سحرِ بنگال از طاہرہ دیوی: حبش اور اطالیہ مرتبہ اختر حسین رائے پوری: کلیم عجم مصنفہ علامہ سیماب اکبر آبادی۔

قاضی صاحب نے متذکرہ بالا تبصروں میں دو ہزار کے قریب تحقیقی بیانات کی تصحیح کی۔ بعض تسامحات کے علاوہ مجموعی طور پر اُن کے اعتراضات اور اصلاحات کو تسلیم کیا گیا۔ محتاط اندازے کے مطابق ایک یا دو فیصد اعتراضات بے بنیاد تھے اور اسی تناسب سے بعد کی تحقیقات سے اُن کی فراہم کردہ معلومات میں اضافہ ممکن ہوا۔ اس کے علاوہ ان تبصروں میں انھوں نے ہر صنف کے فنی تقاضوں کو بھی اجاگر کیا جس کی بدولت ان اصناف کے بارے

میں فکری سطح پر تبدیلی کا رجحان پیدا تو ہوا، مگر خوش دلی سے اس کا اعتراف بہت کم ہوا۔ قاضی صاحب کے تنقیدی رویے کے بارے میں کلیم الدین احمد نے لکھا:

”سائنٹسٹ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو نئی نئی دریافتیں کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو ان نئی دریافتوں کو تنقید کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور کہیں کوئی کمی رہ گئی ہے تو اسے بتاتے ہیں۔ یعنی ایک تو Scientists ہوئے اور دوسرے Critics of the Scientists ہوئے۔ کیونکہ بہت سی دریافتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی بنیاد مفروضوں پر ہوتی ہے یا جن میں بہت پیچیدہ حساب کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ نقاد دیکھتے ہیں کہ مفروضوں میں کوئی جھول تو نہیں یا حساب میں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی۔ اسی طرح قاضی صاحب یہ دیکھتے ہیں کہ کسی تحقیقی کتاب یا تحقیقی مقالے میں کوئی کمی یا غلطی رہ گئی ہے یا نہیں۔ چونکہ اردو میں تحقیق کا معیار اچھا نہیں ہے اور قاضی صاحب کا معیار بہت بلند ہے اور وہ اسے بلند رکھنا چاہتے ہیں، اس لیے انھیں ان کتابوں اور مقالوں میں ان گنت خامیاں اور غلطیاں دکھائی دیتی ہیں۔ جن کی طرف وہ مصنفین اور قارئین دونوں کی توجہ مبذول کرتے ہیں۔ آرنلڈ نے تنقید کے بارے میں کہا تھا Let us keep our standard high. قاضی صاحب کا تحقیق کے بارے میں بھی یہی خیال ہے۔ معیار بلند رکھو اور وہ معیار کو بلند رکھتے ہیں۔ یہی بات لوگوں پر جبر گزرتی ہے لیکن

اس میں قاضی صاحب کا کیا قصور؟ [۷]

قاضی صاحب کی تنقید نے اردو میں تحقیق اور تنقید کے معیار کو بلند کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ بیسویں صدی کے تمام بڑے محققین ان کے سخت تنقیدی تبصروں کی روشنی میں محتاط ہوئے۔ بہ قول رشید حسن خاں جب کوئی اہم کتاب شائع ہوتی تھی تو انتظار کیا جاتا تھا کہ قاضی صاحب اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ اور تبصرے میں قاضی صاحب مصنف کی برسوں کی محنت پر اضافے اور تصحیح سے سب کو حیران کر دیتے تھے۔ بیسویں صدی کے محققین پر ان کے اثرات کا اندازہ لگانے کے لیے مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا بیان ملاحظہ کیجیے۔ علی گڑھ میں ہسٹری کی ایک کانفرنس میں جناب عرشی نے پروفیسر سید حسن عسکری سے تبادلہ خیالات کے دوران قاضی صاحب کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا:

” میں صرف ایک شخص سے ڈرتا ہوں اور وہ یہی آپ کے قاضی صاحب ہیں۔ قاضی صاحب کی تنقید میں دل آزاری، استہزاء، بد گوئی اور کسی قسم کی عصبیت اور ہٹ دھرمی کا شائبہ نہیں ہوتا۔ اُن کی تنقیدیں تخریبی نہیں تعمیری ہی کہی جاسکتی ہیں۔ اُن کی مبصرانہ، نقادانہ نظر نقائص پر ہی مرکوز نہیں رہتی، لیکن جب جس چیز کو وہ خامی اور کمزوری سے خالی نہیں سمجھتے اور وہ اُن کے سامنے آجاتی ہے تو اُن کی زبان اور قلم رواں دواں ہو جاتے ہیں۔ گفتار آگے چل کر تحریر کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ کچھ لوگ شاید اسے خوردہ گیری سمجھیں لیکن قاضی صاحب اپنی ذہنی افتاد، فکری مزاج، تحقیقی رجحانات سے مجبور ہو کر زبان و قلم سے کام لینے لگتے ہیں۔ ظاہر داری، تکلف اور بے جا طرف داری سے انھیں نفور ہے۔ علمی، تحقیقی، تاریخی اور ادبی امور پر خاموشی انھیں طبعاً ناپسند ہے۔ لیکن لفظی نزاع بحث و تکرار، رد و قدح، جواب الجواب کے مروجہ طریقوں سے وہ کوسوں دور رہتے ہیں۔^[۸]

حوالہ جات

- (۱) عابد رضا بیدار، ڈاکٹر (مرتب)، قاضی عبدالودود کا ۱۹۳۶ء کا معیار (پٹنہ، خدابخش اور نیشنل پبلک لائبریری، ۱۹۸۱ء) ص ۲۳۴۔
- (۲) قاضی عبدالودود، سیمینار کے مقالے (پٹنہ، بہار اردو اکادمی، ۱۹۹۶ء) ص ۱۔
- (۳) قاضی عبدالودود، کچھ غالب کے بارے میں (پٹنہ، خدابخش اور نیشنل پبلک لائبریری، ۱۹۹۵ء) ص ۵۸۔
- (۴) قاضی عبدالودود، اردو میں ادبی تحقیق کے بارے میں (پٹنہ، خدابخش اور نیشنل پبلک لائبریری، ۱۹۹۵ء) ص ۳۳-۳۴۔
- (۵) علی گڑھ میگزین غالب نمبر: ۱۹۳۹ء: ص ۱۷۲۔
- (۶) قاضی عبدالودود، غالب بحیثیت محقق (پٹنہ، خدابخش اور نیشنل پبلک لائبریری، ۱۹۹۵ء) ص ۵۔
- (۷) ”معاصر“ قاضی عبدالودود نمبر: کلیم الدین احمد (مدیر)، (پٹنہ، دائرہ ادب، ۱۹۷۶ء) ص ۷۷-۷۲۔
- (۸) ایضاً: ص ۱۹۸۔